سوز وساز

خالی

سوز و ساز

(کچھ غزلیں کچھ نظمیں کا نیا ایڈیشن)

رضی عابدی

سانجھ
SANJH
PUBLICATIONS

پرنٹ لائن

طالب علموں کے نام

خالی

فہرست

غزلیں 9

قطعات 54

ہدیہ عقیدت 55

مادرِ علمی 58

والعصر 60

جامعہ پنجاب کی صد سالہ تقریبات پر 66

آزاد نظمیں 68

محرومی 70

تلاش 77

کچھ بھی نہیں 83

نثری نظمیں 86

نیا سال 1987ء 88

خوف 90

نظریہ 92

اپنا سایہ	94
عزت	95
ٹوپی	97
تخلیق	99
مکتب	101
اے اللہ	102
خلاء	103
عصمت	104
نیا عالمی نظام	106
طنز و مزاح	108
بزمِ مشاعرہ	110
مَیں	114
مشقِ سحر	118
گرلز کالج	121
ناکردہ گناہ	125
شکوہ طالب علم بحضور ممتحنِ محترم	127
شکوہ اقبال	131
واہ	134
ٹیڈی گرل	137
الوداع	141

غزلیں

خالی

کچھ زخم تجھے ڈھونڈ کے پانے میں لگے ہیں
کچھ تجھ سے محبت کے نبھانے میں لگے ہیں

ان میں بھی جھلک پڑتی ہے اپنے ہی لہو کی
جو نقش ترے آئنہ خانے میں لگے ہیں

تعمیر تو کیا حسرتِ تعمیر نہیں ہے
ہم پھر بھی ترے ناز اُٹھانے میں لگے ہیں

وہ تیز ہوا ہے کہ بجھی جاتی ہیں شمعیں
اور آپ اندھیروں کو سجانے میں لگے ہیں

اک عمر سے انصاف کی زنجیر سمجھ کر
ہم پاؤں کی زنجیر ہلانے میں لگے ہیں

صحراؤں کے مزدور بھی تیشوں کو سنبھالے
فرہاد کو مجنوں سے ملانے میں لگے ہیں

خود ہی جو اُٹھائی تھی ہر اک جبر کو سہہ کر
وہ ظلم کی دیوار گرانے میں لگے ہیں

کیا سادہ ہیں ہم سر کو تہہِ تیغ جھکا کر
قاتل کو مسیحائی سکھانے میں لگے ہیں

شاید کبھی ہم بارِ امانت بھی اُٹھائیں
اب تک تو جنازے ہی اُٹھانے میں لگے ہیں

(1989)

اندھیر نگری کے شاہزادو! یہ رات بس ایک دو گھڑی ہے
دلوں کے گھاؤ چمک اُٹھے ہیں لہو کی ندی ابل پڑی ہے

تم اس کو قسمت کو بات جانو اسے مقدر کا کھیل سمجھو
ہدائتیں احمقوں سے لینا یہ آزمائش بہت کڑی ہے

تمھارے قبضہ میں دُکھ ہی دکھ ہیں مگر سنو موت کے فرشتو
ہماری جھولی میں زندگی ہے جو سب دکھوں سے بہت بڑی ہے

ہماری آنکھوں میں آنکھیں ڈالو تو جان لو گے کہ اپنی بازی
زمین کی بیداد سے ٹھنی ہے فلک کی رفتار سے لڑی ہے

شہر شہر جشن کا سماں ہے وہ موت کا رقص ہو رہا ہے
اُفق پہ ایسے انار چلتے ہیں جیسے برسات کی جھڑی ہے

لہو برستی رہیں جو آنکھیں اب ان سے شعلے نکل رہے ہیں
ہماری دنیا یہ لگ رہا ہے کسی نئے موڑ پر کھڑی ہے

تمھاری خاطر نجانے کب کی ہمیں تو معراج مل چکی ہے
جو ہم اُٹھا کر صلیب لائے تھے اب تمھارے لئے گڑی ہے
(بحوالہ اوجڑی کیمپ 1988)

سورج کی شعاؤں کو باندھو تاروں کی چمک کو قید کرو
دامن تو بچانا مشکل ہے شعلوں کی لپک کو قید کرو

ایک ایک کرن کو قید کیا تو کتنے ظلم چمک اُٹھے
اب رت ہے آتش بازی کی اس نئی دھنک کو قید کرو

یہ الھڑ پن ہے پھوٹ پڑے گا دیواروں دروازوں سے
ایک ایک جھروکا چنوا دو ایک ایک جھلک کو قید کرو

ہم وقت ہیں ابن الوقت نہیں تاریخ بھی ہم تقدیر بھی ہم
پہناؤ نہ ہم کو زنجیریں رفتارِ فلک کو قید کرو

ہنستی آنکھیں کھلتے چہرے جو تم سے نہیں دیکھے جاتے
کلیوں کا چٹکنا بند کرو پھولوں کی مہک کو قید کرو

آنکھیں بھی بہت کچھ کہہ دیتی ہیں ہونٹ نہ جب ملنے پائیں
ایک ایک نظر ہنگامہ ہے ایک ایک پلک کو قید کرو

دل مجنوں ہے منصور ہے دل بیباک بھی ہے مجبور بھی ہے
روندا بھی گیا تو کیا ہو گا سبزے کی مہک کو قید کرو

(1980)

یوں تو غبارے بھی کھلتے ہیں شوخی سے لہراتے ہیں
جن کا دھرتی سے ناطہ ہو پھول وہی کہلاتے ہیں

جتنے تجھ پر زخم لگے ہیں اتنا میں بھی ٹوٹا ہوں
اے میرے خوابوں کی جنت خواب بکھرتے جاتے ہیں

سوندھی سوندھی کھیت کی مٹی جانے کیسے خوشبو ہو
پتھر سڑکوں اندھی گلیوں ہم بھی کھوج لگاتے ہیں

اپنے دُکھ میں یہ دُکھ بھی ہے نہ کوئی قاتل نہ مقتول
سچائی کا حرف ہے سولی ہم سولی چڑھ جاتے ہیں

نہ ہم گاہک نہ سوداگر ہم سے لینا دینا کیا
پھر بھی ہیں بازار کی رونق دیوانے کہلاتے ہیں

مست ہواؤں بھیگی آنکھوں سے دیوانے دل کیا دھڑکیں
گھڑیوں کی رفتار سے اب تو نبض کی چال ملاتے ہیں

پتھر کے بھگوان کو راضی کرنا کوئی بات نہیں
بھگتوں کا ڈر ہے تو ایسے ایسے سوانگ رچاتے ہیں
(1983)

نہ محبت سے نہ ڈر سے نہ حیا سے اُٹھیں
بیٹھ جائیں جو بٹھا دے جو اُٹھا دے اُٹھیں

وہ جو اک عمر سے لذت کش محرومی ہیں
ان سے کس طرح ترے پیار کے صدمے اُٹھیں

گزری جاتی ہے قیامت پہ قیامت دن رات
اب کوئی صور پھنکے گا کہ یہ مردے اُٹھیں

اور ہوں گے جو لئے پھرتے ہوں طوفاں دل میں
ہم تو صحرا بھی نہیں ہیں کہ بگولے اُٹھیں

یوں بھی ہوتا ہے کہ فولاد سی بنیادوں پر
جب محل ٹھہر نہ پائیں تو خرابے اُٹھیں

وہ جو ایک ایک ہیں گھیرے ہوئے دس دس کی جگہ
کیوں نہ پہلے انھیں محفل سے اُٹھا کے اُٹھیں

ایک ہم ہیں کہ نہیں کوئی شناسا اپنا
ایک تو ہے کہ ترے نام پہ فتنے اُٹھیں
(1991)

بات اتنی بھی نہ تھی جی سے گزر جاتے ہم
اک نگاہِ غلط انداز سے مر جاتے ہم

اب تو یوں لگتا ہے بس غم نے جکڑ رکھا ہے
غم نہ ہوتے تو بھلا کب کے بکھر جاتے ہم

دوپہر بھی نہ ڈھلی اور نہ پتھر ہی کٹے
شام ہوتی تو کہیں لوٹ کے گھر جاتے ہم

منزلِ شوق ہی ویران پڑی ہے کب سے
ورنہ اس راہ سے یوں خاک بسر جاتے ہم

تجھ سے ساون کی گھٹائیں تو نہیں مانگی تھیں
اتنے پیاسے تھے کہ اک بوند سے بھر جاتے ہم

کیسا کیسا نہ زمانے نے تراشا ہم کو
سخت پتھر بھی جو ہوتے تو سنور جاتے ہم

دُکھ کے صحراؤں میں چیخوں نے قدم روک لیے
ورنہ آنکھوں کے سمندر میں اُتر جاتے ہم

زرد چہرے پہ تھا گزری ہوئی خوشیوں کا غبار
پیار کی بوند بھی پڑتی تو نکھر جاتے ہم

نہ بلاتے ہمیں محفل تو سجائی ہوتی
لوحِ احساس پہ دُکھ بن کے اُبھر جاتے ہم
(1981)

جو گیا پھر وہ یاد آیا نہیں
ہم نے دنیا سے دل لگایا نہیں

آنکھ کھولو کوئی تو شمع جلاؤ
رات ہے گیسوؤں کا سایا نہیں

جانے کیا کیا شکایتیں ہوتیں
شکر ہے ہم نے آزمایا نہیں
(1978)

خواب دیکھیں گے تو پھر خواب پریشاں ہوں گے
ہم پشیماں ہوئے اب آپ پشیماں ہوں گے

آرزوئیں ابھی ناسور نہیں بن پائیں
ظلم کے داغ ابھی اور نمایاں ہوں گے

ہم نے آخر ابھی اس دور میں دیکھا کیا ہے
ہم جو حیراں ہیں ابھی اور بھی حیراں ہوں گے

اب نہ ہو گا میرے شہروں پہ ہما کا سایہ
اب اندھیرے ہی اُجالوں کے نگہبان ہوں گے

پھول سے چہرے اندھیروں میں ڈھلے جاتے ہیں
یہ الگ بات کہ شہروں میں چراغاں ہوں گے

درد مٹ جائے گا تو ظلم سے بھر جائیں گے دل
باغ جب باغ نہ ہوں گے تو بیاباں ہوں گے

حکم ہے قمری و بلبل کوئی شورش نہ کریں
کرگس و زاغ سُنا ہے کہ غزل خواں ہوں گے

ایک اک زخم سے اُچھلے گا اُبلتا ہوا خوں
اپنے ویرانے اسی طرح فروزاں ہوں گے

تختۂ دار ہو، دُرّے ہوں کہ بندی خانے
یہ مرے دور کے افسانے کے عنواں ہوں گے
(1977)

جس کو ڈھونڈا جسے چاہا نہ ملا
یعنی ہم کو کوئی تجھ سا نہ ملا

یوں تو ہر آنکھ میں افسانے تھے
جو نگاہوں میں بسا تھا نہ ملا

زندگی موت، محبت حسرت
تیرے ملنے سے ہمیں کیا نہ ملا

دل ہے تنہائی سے بیزار جو آیا ہوں یہاں
ورنہ میں اور تری معصوم نگاہی کا گماں

مجھ کو خود غرضی و بیداد کے الزام نہ دے
میں بھی آخر تو ہوں منجملۂ ارباب جہاں

مسکراتے ہوئے ہونٹوں نے دیئے ہیں وہ فریب
خندۂ گل نظر آتا ہے مجھے طنز کناں

تلخئ درد بدل دیتی ہے فطرت کا مزاج
پھول چبھتے ہیں گزرتی ہے جو تنہائی گراں

کوئی پامال سی پامال ہے یہ راہِ حیات
اب تو ڈھونڈے سے بھی ملتے نہیں قدموں کے نشاں

وسوسے ہوتے ہیں جب پیشِ نظر ہو منزل
راہِ ہستی میں بھلا کیا گلہِ ہم سفراں

قصۂ درد نہیں شکوۂ احباب مگر
مختلف ہوتی ہے کچھ سوزِ محبت کی زباں
(1965)

خجل یہ ہونا پڑا عمر رائیگاں سے مجھے
کہ ایک ربط رہا تیری داستاں سے مجھے

ہزار ترکِ تعلق کے بعد بھی دل نے
ترے فسانے سنائے مری زباں سے مجھے

تیری تلاش تو کرتا میں کوبکو لیکن
یہ بام و در نظر آئے دھواں دھواں سے مجھے

خرد کےنام پہ کارِ جہاں میں اُلجھا کر
اُٹھا دیا گیا جلووں کے درمیاں سے مجھے

یہ کیا ضرور کہ پیہم شکائتیں ہی رہیں
مری زمیں سے تجھے تیرے آسماں سے مجھے

بھری بہار سے تنہائیوں سے یادوں سے
صدائیں آئی میں تیری کہاں کہاں سے مجھے

یقیں پہ کس کو بھروسہ ہے بدگمانی میں
تری نہیں میں زیادہ مزہ ہے ہاں سے مجھے

سنا رہا ہے کسی کا بنا کے افسانہ
یہی بس ایک شکایت ہے قصہ خواں سے مجھے
(1964)

چاہے بھلے ہوں چاہے بُرے ہوں ہر صورت تڑپاتے ہیں
مہر و وفا کی بات نہیں ہے دوست بہت یاد آتے ہیں

دنیا دھوکا مایا کھوٹی لوگ یہاں سب جھوٹے ہیں
کیسی کیسی باتیں کر کے، ہم دل کو بہلاتے ہیں

دل ہی اپنا بس میں نہیں ہے دل ہی اپنا دشمن ہے
اوروں پر الزام نہیں وہ تو اپنے بن جاتے ہیں

کیسا ہنسنا کیسا رونا ایک تماشہ ہیں دنیا کا
آرائش کا قمقمہ جیسے جلتے ہیں بجھ جاتے ہیں

تیرا نام بھی لب پر لاتے اب اس واسطے ڈرتے ہیں
لوگ بہت ہیں اور لوگوں میں افسانے کھو جاتے ہیں

جیسی ہم پر گزری سب پر ایسی کچھ ہی گذرتی ہے
جھوٹے سچے قصوں سے ہم کونسی بات بتاتے ہیں

یوں تو شاید کوئی ملا ہو لیکن بچھڑے کتنے دوست
جس کو کھو دیتے ہیں گویا صرف اسی کو پاتے ہیں
(1964)

نیرنگِ جہاں دیکھ کے خاموش ہوں ورنہ
دنیا مرے افکار کی کچھ تنگ نہیں ہے

ہستی میں کب آئے تھے عدم سے نہیں معلوم
ہاں یہ ہے کہ جینے کا ابھی ڈھنگ نہیں ہے

سر پھوڑ کے مرنے کی تسلی سے بھی گزرے
اب راہِ جنوں رہگزر سنگ نہیں ہے

اک گرمیٔ افکار ہے دل چاہے کہیں ہو
اس شاہ کو لازم کوئی اورنگ نہیں ہے

شاکی ہے فقط رسم و رہِ اہل وفا سے
اتنا روشِ عام سے دل تنگ نہیں ہے
(1962)

یوں ڈھونڈنے کی دھن میں لگے ڈھونڈتے رہے
سورج کو بھی چراغ لیے ڈھونڈتے رہے

ایسا تو کچھ پتہ ترا دشوار بھی نہ تھا
حالات سازگار نہ تھے ڈھونڈتے رہے

سو بار پا کے پھر وہی احساسِ تشنگی
تیری تلاش میں یہ کیسے ڈھونڈتے رہے

وہ خبط تھا، جنوں تھا، بہر حال خوب تھا
پھر ہم وہ تیرے غم کے مزے ڈھونڈتے رہے

یوں داغ بن کے رہ گئی جلوؤں کی دوپہر
ایک اک کرن کو شام ڈھلے ڈھونڈتے رہے

کھو آئے تھے جو خود کو تری رہگزر میں ہم
ہر ایک رہگزر میں تجھے ڈھونڈتے رہے

سائے سے تیرتے تھے نگاہوں کے سامنے
شاید کوئی چراغ جلے ڈھونڈتے رہے

ہنگامۂ شعور میں آساں نہ تھی تلاش
ادراک کی حدوں سے پرے ڈھونڈتے رہے

میں تھا کہ کھو گیا تھا کسی کی تلاش میں
میرے حواس تھے کہ مجھے ڈھونڈتے رہے
(1962)

یادوں کی وادیوں سے اُبھرتے ہیں چند سائے
دھیمے سروں میں دور کی آواز جیسے آئے

یہ سرمئی فضا سے جھلکتی ہوئی شفق
کیا کیا حسین لوگ خیالوں میں لوٹ آئے

کتنی حسین ہیں تری دنیا کی رونقیں
ہم نے قدم قدم پہ خوشی سے فریب کھائے

تیری عنائتوں کے سوا یاد کچھ نہیں
آنے کو زندگی میں بہت انقلاب آئے

دل کو دیا ہے تیرے تغافل نے بارہا
وہ درد جو سکون بھی دے ٹیس بھی اُٹھائے

غمہائے زندگی سے عقیدت سی ہو گئی
آنسو کچھ اس طرح تری آنکھوں میں جھلملائے

مانوس اب تو ہونے لگا سوزِ غم سے دل
اب چشمِ التفات سے کہہ دو کہ مسکرائے

کس کس کو تیرے بعد سناتے پھرے ہیں ہم
وہ داستاں جو آنکھ سنے آنکھ ہی سنائے
(1961)

اپنی بات سمجھنے والے جانے کب کے چھوٹے لوگ
دل کی ویرانی کا کارن پوچھ رہے ہیں ہم سے لوگ

سونے سونے سے لگتے ہیں تنہائی میں ہنگامے
ان راہوں میں مل کر بچھڑے کیسے کیسے پیارے لوگ

اب ہم ایسے بکھر گئے ہیں جیسے موتی شبنم کے
پھولوں کی وادی میں لیکن اک دریا تھے اگلے لوگ

وہ بھی ایک دنیا تھی جب انسان کو تھا انسان کا غم
یہ بھی اک دنیا ہے اب بیگانے ہیں نہ اپنے لوگ

دنیا دھوکا دل بھی دھوکا دھوکے کی ہے جو ہے بات
پھر آخر کیوں دل والے ہی کہلائیں دیوانے لوگ

دل کی حالت دیکھ کے اکثر عقل بہک ہی جاتی ہے
ایک ہمیں سمجھانے آئے کیسے کیسے سیانے لوگ

ساری دنیا چھوڑ کے ہم نے اک دل کو اپنایا تھا
لیکن دل کی راہوں میں بھی ڈال گئے کچھ کانٹے لوگ

چاند ستاروں کی دنیا میں کب سے ہے انسان دُکھی
ایک بھیانک خاموشی میں ڈوبے کیا کیا پیارے لوگ

اک دیوانہ پن کے سہارے اپنے من کی راہ کٹی
یوں تو ہمیں سمجھانے آئے جانے کیسے کیسے سیانے لوگ

دل کی خاطر اکثر ہم نے سوچ سمجھ کر دھوکے کھائے
ایک ہماری راہ میں آئے کیسے کیسے سیانے لوگ

ہم ہی تھے کہ قدم قدم پر کتنے پیار سے کھائی چوٹ
ایک ذرا سی ٹھیس لگی تو صحرا صحرا نکلے لوگ

پکڑے جائیں نہ رو کے جائیں اُف یہ ظالم دل کے چور
سیدھی سادھی باتیں ان کی سیدھے سادھے لوگ
(1960)

جس کو آنا تھا وہ آیا ،جسے جانا تھا گیا
تجھ سے جذبۂ دل کچھ نہ ہوا کچھ یہ بتا

ہدیۂ دوست سمجھ کر جسے پہلو میں رکھا
اک وہی رنگ کبھی آگ کبھی پھول بنا

آنکھوں آنکھوں میں کٹی جاتی ہے تاروں بھری رات
عشق بدظن ہوا جاتا ہے، اب آنا تو آ

اب کہاں انجمن شوق کہاں جلوہ دوست
ہو گئے خواب وہ لمحے ، وہ زمانہ گذرا

ساز خاموش ہیں ، جذبات کو نیند آنے لگی
ساقیا جام اٹھا ، جام اٹھا جام اٹھا!

جھلملاتے ہیں ان آنکھوں میں محبت کے چراغ
جانے کیا ڈوبتی نظروں سے نسور پھونک دیا

راہ گم کردہ مسافر کو نشان منزل
نوکِ مژگاں پہ جھلکتے ہوئے تارے سے ملا

اور تو کون سمجھتا تھا بھری محفل میں
تیری آنکھوں کا فسانہ میری آنکھوں نے سنا

(1958)

نظر اُداس، نظارے خموش، دل بیزار
جنونِ شوق یہ منزل ہے یا کہ راہگذار

نہ جوشِ آتش گل ہے نہ خوفِ برق وشرار
نئی نئی سی اسیری نئی نئی سی بہار

ذرا سی بات بنی اک فسانہ آخرکار
مری نگاہ کی شوخی تری نظر کا خمار

غم حیات کے مارے ابھی تو سوئے ہیں
ابھی نہ دے اے نسیمِ سحر نوید بہار

غمِ جہاں، غم جستجو، غم جاناں
کہاں کہاں نہ ملا اک شکستہ دل کو قرار

تری ہی یاد سہارا دئے رہی ورنہ
کہاں گزرتے ہیں تنہائیوں میں نیل ونہار

ترے بغیر اندھیروں میں کھو گئے جلوے
تری نظر سے فروزاں تھے آرزو کے دیار

نہ انتظارِ سحر اب ہے اور نہ وعدۂ شام
کہ رہ گیا ہے خلاؤں پہ زندگی کا مدار

نہ پوچھ کیسا یہ عالم ہوا ہے وحشت میں
گلوں کی آنچ سے بجھنے لگے ہیں دل کے شرار
(1959)

کیجئے کیا تیری بدلی ہوئی نظروں کا گلا
محفلِ شب کے چراغوں کا دھواں بھی نہ رہا

بارہا محفل اغیار میں ایسا بھی ہوا
کان میں گونج گئی ہے کوئی مانوس صدا

ہم بھی کھاتے رہے معصوم نگاہوں کے فریب
تم بھی دیتے رہے بہکے ہوئے جذبوں کو ہوا

تو نے وعدہ تو کیا ایک فریب اور سہی
یوں بھی جی لیں گے کہ دنیا ہے مسلسل دھوکا

میری کم مائگی اشک پہ دلگیر نہ ہو
میرے پہلو میں بھی اک جام ہے چھلکا چھلکا

پھر ستانے لگے محرومئ قسمت کے خیال
طرزِ بے مہرئ احباب سے دل ٹوٹ چلا

سازِ ہستی نہ رہے تشنۂ مضراب نظر
مرے ساقی مجھے آنکھوں کے وہ نغمات پلا

کشمکش ہے غم دنیا و غم دل میں ابھی
تیرا آنا بھی مصیبت ترا جانا بھی بلا
(1959)

کسی طرح تو بسر ہو یہ ہوش یا بجنوں
کہاں فریبِ تمنا کسے تلاشِ سکوں

میرے جنوں کو تسکین میرا حال زبوں
ترے کرم کا فسانہ بیاں کروں نہ کروں

ترے خیال میں پھر کھو گئے ہیں قلب و نظر
ترے خیال میں پھر درد پا رہا ہے سکوں

دیا ہے جام بلب ساقئ ازل نے مجھے
دلوں کا درد، نگاہوں کا سوز، قلب کا خوں

جو یاد بن کے مرے دل کا درد ہو بیٹھے
ترے حضور میں وہ لمحے نذر پیش کروں

وفا کی تجھ سے تمنا نہ بے رخی کا خیال
مرے جہاں میں رہا کیا کہ میں جیوں ہی جیوں

حضورِ حسن میں بیچارگیٔ عشق نہ پوچھ
ہزار بار بھلاؤں مگر بھلا نہ سکوں

مرے لیے تو یہی زندگی ہے اب شاید
کہ تیرے حسنِ عنایات کو دعائیں دوں

وہ بات جس کی شکایت ہے اک زمانہ سے
خطا معاف، مرے مہربان میں بھی سنوں
(1957)

اب کہاں وہ مجلسیں کہ اب تو ہم
اس دواخانہ سے نکلے اس دواخانہ گئے

کیا کریں اب ان لرزتی انگلیوں میں دم نہیں
خم چھلکتے ہیں مگر ہاتھوں سے پیمانے گئے

اب ہیں یاروں میں دواؤں ڈاکٹروں کے تذکرے
اب حسینوں کی اداؤں کے وہ افسانے گئے
(2005)

انصاف کا نہ دادِ رسائی کا وقت تھا
جو ناخدا تھے ان کی خدائی کا وقت تھا

یہ کیا ہوا کہ باغ میں کلیاں چٹک اُٹھیں
یہ وقت تو گلوں کی وداعی کا وقت تھا

آزاد گانِ شوق گرفتار کب ہوئے
جو وقت قیدیوں کی رہائی کا وقت تھا

ایسے ملے کہ ملتے ہی دل ڈوبنے لگا
تھی وصل کی گھڑی کی جدائی کا وقت تھا

آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑی ٹوٹتی نہ تھی
صلح کی بات تھی نہ صفائی کا وقت تھا

تم نے تو مسکرا کے ستم اور کر دیا
رخصت کا وقت، عقدہ کشائی کا وقت تھا

نہ ہوش نہ حواس نہ حسرت نہ آرزو
دشتِ جنوں میں آبلہ پائی کا وقت تھا
(2006)

اگرچہ زہرہ جبینوں میں زندگی گزری
مگر جب ایک سے اُلجھی بہت بری گزری

یہ ایک جہاں کہ ترستا ہے چاہتوں کے لیے
ہمیں تو سخت بہت رسمِ عاشقی گزری

نہ خواہش، نہ اُمیدیں، نہ مدعا نہ غرض
ایک انتظار سا تھا جس میں زندگی گزری

ہمیں تلاش تھی جس کی اُسی کو بھول گئے
یہ واردات بھی ہم پر کبھی کبھی گزری

بندھی تھی جن سے اُمیدیں وہ ساتھ چھوڑ گئے
مگر گزر گئی جیسی بُری بھلی گزری

تڑپ تڑپ کے گزاری ہے زندگی ہم نے
مگر خیال سے دیکھا تو خواب سی گزری

جو دل میں آگ لگی تھی زباں تک آ نہ سکی
مزے سے یوں تو بظاہر ہنسی خوشی گزری

ہمیں نصیب سے اپنے کوئی گلہ بھی نہیں
غموں کی بھول بھلیوں سے ہر خوشی گزری

ہمیں ہر ایک نے سمجھایا، ہم ہی نہیں سمجھے
جنوں کی راہ سے شرمندہ، آگہی گزری
(2008)

قطعات

آنسو

دل کے جذبات کی تفسیر جمیل
مئے احساس سے لبریز ایاغ

نظرِ منتظر کی راہوں پر
ٹمٹماتا ہوا منزل کا چراغ
(1949)

آخرِ شب

آخرِ شب میں تڑپتے ہوئے ننھے تارے
راز جب ہستیٔ موہوم کا کہہ جاتے ہیں

میری آنکھوں میں جھلکتے ہوئے پیہم آنسو
ظلمتِ شب میں کہیں ڈوب کے رہ جاتے ہیں
(1950)

ہدیۂ عقیدت

اے حسین علیہ السلام
تیری مظلومیت کو سلام
جس کے سائے میں پلتی پنپتی رہیں
شوق کی ہمتیں
سوچ کی جرأتیں
ابھی آنکھ شاید کھلی بھی نہ تھی
کہ ماتم کی آواز آنے لگی
ماں کی آغوش میں
تیرے نوحوں کی لوری سُلاتی رہی
تیرے ماتم کی آواز آتی رہی
تھپتھپاتی رہی اور جگاتی رہی

اور یوں تیرے غم
لوریاں بن کے کانوں میں گھلنے لگے
ہوش کی منزلوں میں پڑے جب قدم
تو یہ سب الم
روح کی وسعتوں میں اُترنے لگے
بکھرنے لگے
یہ بچپن کے غم
کتنے معصوم تھے
چھوٹے بچوں کے سوکھے گلے
اور ماؤں کی بیچارگی
خاک اور خون میں لتھڑے ہوئے بانکپن
ازل کے دشت میں
ظلم کے قافلے
ایک آواز ماحول کو چیرتی
درد میں گونجتی
ہے کوئی جو سنے میری فریاد کو
آئے امداد کو
دل دہلاتی رہی
خود رلاتی رہی

پھر روزِ عاشور ہے
وادیوں سے
پہاڑوں سے
صحراؤں سے
ہر اک گاؤں سے
آ رہی ہے صدا
یاحسین، یاحسین
گلی اور کوچوں
گھروں اور چھتوں سے
ماتم کی آواز آ رہی ہے
خوں رلوا رہی ہے
چھوٹے بچوں کی
بے حال ماؤں کی
فریاد سے
نوجوانوں کی للکار سے
اِک کہرام سا مچ رہا ہے
خوں رلوا رہا ہے
مگر کوئی بھی
اُن کی فریاد سنتا نہیں

مادرِ علمی

خالی

والعصر

مال پر
سہ پہر کی دھندلی سی خاموشی
اُترتی جارہی ہے
اور عجائب گھر کی چھوٹی برجیوں کے لمبے سائے
جامعہءپنجاب تک بڑھنے لگے ہیں
یہ عجائب گھر ہے جس میں
گزری صدیوں کی کہانی
منجمد محفوظ
سربستہ پڑی ہے

اور اب
اس عجائب گھر کی چھوٹی برجیوں کے لمبے سائے
جامعہ پنجاب تک بڑھنے لگے ہیں
جامعہ پنجاب کے گھڑیال پر
اب چار بجنے ہی لگے ہیں
ایسا لگتا
کہ جیسے
پہلے بھی یہاں پڑھتی رہی ہیں
آج سے کچھ سال پہلے
آپ شاید آصفہ ہیں
''جی نہیں''
تو پھر یقیناً نازلی ہیں
''جی نہیں''
وہ تو میری سینئر تھیں
آپ تو
سر
جب ہم یہاں سے جائیں گے تو
ہم کو بالکل بھول جائیں گے
ہمارے نام تک بھی

آپ کوتو یاد رہ سکتے نہیں

بی بی

یہ ہمارا علم کا رشتہ ہے

یہ قائم رہے گا

کیا بتائیں

چند سالوں سے عجب سا ہو رہا ہے

لوگ آتے ہیں چلے جاتے ہیں لوگ

لیکن لگتا ہے کہ جیسے

کوئی آتا ہے نہ جاتا ہے کوئی

سال بسال

بس فقط نام بدل جاتے ہیں

یا

پھر ان کے سائے

بار بار آتے ہیں

اور آ کے چلے جاتے ہیں

جامعۂ پنجاب کے گھڑیال پر

اب چار بجنے ہی لگے ہیں

ادھر مغلوں کی پوشاکیں پڑی ہیں

وہ غلاموں کے زمانے کے نوادر ہیں

یہ برتن ہیں وہ زیور ہیں
یہ صناعی کے کچھ اعلیٰ نمونے ہیں
اُدھر گوتم کے بت
آسن جمائے بس یونہی صدیوں سے بیٹھے ہیں
یہ کچھ
تاریخ کے کیپسول ہیں
فاسلز ہیں
کہ جن کو ہم نے
اپنے بچوں نوجوانوں
اور سیاحوں کی
تفریح کی خاطر
یہاں محفوظ کر کے رکھ دیا ہے
اور اب
اس عجائب گھر کی چھوٹی برجیوں کے لمبے سائے
جامعۂ پنجاب پر پڑنے لگے ہیں

وقت کو روکو تو رک سکتا ہے
اس کے سو طریقے ہیں
بپھرتے بازوؤں میں کلبلاتی بجلیوں کو

نگاہوں کی چمک کو
گیسو و رخسار کی رعنائیوں کو
بند کیپسولوں میں رکھ سکتے ہیں
لیکن
زندگی کب تک رکے گی
وقت ٹھہرے گا کہاں تک
یہ عجائب گھر ہے
اس میں زندگی تو مر چکی ہے
اس کے تیور رہ گئے ہیں
لیکن
اس عجائب گھر کی چھوٹی برجیوں کے لمبے سایوں میں
ابھی کچھ زندگی ہے
جس کی لو تڑپتی ہے ابھی تک
ہاں۔ یہ ہے
کہ اس کے تیور بجھ گئے ہیں
اس کی زرد پیشانی پہ جانے
کب نظر آنے لگیں تیوری کے بل
زندگی جب یوں مقید ہو تو
تو کتنا خوف کتنا ڈر نظر آتا ہے اس سے

جامعہ پنجاب کے گھڑیال پر
اب چار بجنے ہی لگے ہیں
اس کی سوئی کچھ ذرا آگے بڑھی
تو......
ایک لمحے میں ابھی گر چار بج جائیں
......تو
عجائب گھر کی چھوٹی برجیوں کے لمبے سائے
خودبخود ڈھلنے لگیں گے
اور اپنے خوبصورت، صاف اور شفاف
شیشے کے گھروں میں
لوٹ جائیں گے
یہ عجائب گھر کی چھوٹی برجیوں کے لمبے سائے......

(1989)

جامعہ پنجاب کی صد سالہ تقریبات پر

عظمتِ جبہ و دستار کے دن آئے ہیں
کیا کہیں پھر رسن و دار کے دن آئے ہیں

دیکھیں کس کس کے گلے پر یہ چھری چلتی ہے
چشم بد دور کہ سرکار کے دن آئے ہیں

شیخ مکتب نے کیا حجرہ مکتب خالی
رونق کوچہ و بازار کے دن آئے ہیں

محملیں [1] بھی ہیں جھروکے بھی ہیں دیوانے بھی
دعوتِ عام ہے دیدار کے دن آئے ہیں

۱۔ لڑکیاں اور خواتین اساتذہ بسوں میں تھیں جبکہ نوجوان پیدل چل ہرے تھے

چند نعروں میں سمٹ آئے فکر و دانش
علم پر جہل کی یلغار کے دن آئے ہیں

کار طفلاں کی نہ پوچھو کہ ہوا کب کا تمام
اب تو ملاؤں کی بیگار کے دن آئے ہیں

اب چلیں گی نہ یہاں نقد و نظر کی باتیں
اب ذرا چھیڑ چلے یار کے دن آئے ہیں

(1989)

آزاد نظمیں

خالی

محرومی

(۱)

یہ اُجالے یہ اندھیرے یہ ستاروں کا ہجوم
ملگجی شام کہ یادوں کا محل ہو جیسے
دور تا حدِ نظر تیرتے ننھے سائے
جو کبھی
بولتے ہیں کبھی چپ ہوتے ہیں
جیسے سرگوشیاں کرتے ہوئے لوگ
دور سے لگتا ہے خاموش چلے جاتے ہیں
دور سے آتی ہیں جذبات میں ڈوبی ہوئی آوازیں
مگر
قہقہے ہیں
کہ

لرزتے ہوئے ہونٹوں سے نکلتی آہیں
کون جانے کہ حقیقت کیا ہے؟
یہ گزرتے ہوئے لمحے کہ گزرتے ہی نہیں
سرد خانوں میں یہ محفوظ پرانی لاشیں
موت ہے لیکن عجب جاگتی جیتی ہوئی موت
زندگی ہے مگر اس طرح کہ جیسے کوئی تصویر جئے

(۲)

ہر طرف
ایک جمود ایک سکوں
یہ سکوں بھی نہیں سناٹا ہے
جو کسی دور کی آواز کے احساس سے ہو جاتا ہے کچھ اور مہیب
اور یوں لگتا ہے
جیسے
کہ ازل اور ابد
آج اور کل
اس میں یوں ڈوب گئے ہوں
جیسے
کہ کبھی تھے ہی نہیں

کوئی چاہت ہے
نہ چاہت کے نہ ہونے کا خیال
نہ کسی بات کی خواہش
نہ کسی سے وحشت
کوئی منزل نہ کوئی راہگذر
ہم جہاں تھے وہیں موجود ہیں
ہر چیز وہیں ہے کہ جہاں تھی
لیکن
پاؤں ہلتے ہوئے لگتے ہیں
اور ہم سوچتے ہیں
کہ یہ اک قافلۂ شام وسحر ہے
جس میں
ہم مسافر
کسی جانی ہوئی آواز کی دھن میں
ہمہ تن گوش چلے جاتے ہیں

(۳)
ٹھہرنا
تم نے پکارا مجھ کو

اپنی آواز کے شعلے کو ذرا کم کر دو
اپنی آنکھوں میں ذرا روک لو جذبات کی لو
میں تو سوکھے ہوئے پتوں کی طرح
ایک چنگاری سے جل اُٹھوں گا
اور یہ آگ
جو اک بار بھڑک اُٹھے گی
پھر یہ تم سے بھی نہ بجھ پائے گی
ایک اک لفظ پہ دل کھنچتا چلا آتا ہے
میں تمھیں ڈھونڈتا ہوں
وحشتیں میری طرف بڑھتی ہیں
مجھ سے قسمت نے کیا ہے یہ مذاق
خیر
تم اگر چاہو تو بال پریشاں کر لوں
تار تار اپنا گریباں کر لوں
بھول جاؤں
کہ میں کیا ہوں
کہ میرا فرض ہے کیا
تم سے چاہت کے
مری فکر کے

دنیا کے تقاضے
کیا ہیں
بھیگی آنکھوں کے اشاروں پہ
ہر احساس کو قربان کردوں
ہاں چلو یونہی سہی
مجھ سے تم کچھ کبھی چاہو تو سہی

(۴)
آگ ہی آگ ہے
جنگل کی دہکتی ہوئی آگ
شعلے اُٹھتے ہیں
کہ ایک ایک درخت
ایک اک شاخ کو
ہر پتہ کو
آن کی آن جھلس کی رکھ دیں
لیکن اس جنگل میں
کس قدر ٹھنڈ ہے
ان کو چھو کر دیکھو
کتنی خنکی ہے ان انگاروں میں

واقعی آگ ہے یہ
یا فقط آگ کی تصویریں ہیں
یا کسی ذوقِ براہیمی نے
کوئی گلزار سجا رکھا ہے
مجھ کو پھولوں سے نہ بہلاؤ
میں بیتاب ہوں جلنے کے لیے

(۵)

میری محبوب
محبت کے تقاضوں کی قسم
میں نے تجھ کو کبھی چاہا ہی نہیں
کہ مرے واسطے
پھولوں میں اور انگاروں میں کچھ فرق نہ تھا
مسکراہٹ مجھے بہلاتی تھی
اور آنسو بھی بھلے لگتے تھے
مجھ کو معلوم نہ تھا
ڈھونڈھ کے پانا کیا ہے
میں نے جانا ہی نہ تھا
پا کے کھونا تو نہ جانے کیا ہو

صرف کھونے کا تصور ہی بہت بھیانک ہے
اور اب کھونے کے احساس نے پھر یاد دلایا ہے مجھے
کہ مرے دل نے اس انجانے میں
جانی پہچانی ہوئی راہوں میں
جانے کیا کیا کھویا
اور اب موت کی وادی سے جو یہ آتی ہیں آوازیں مجھے
تیری آواز کی جنبش نے جھنجھوڑا ہے انھیں
تیری آنکھوں نے انھیں
زندگی دی ہے
کہ جس کی خود انھیں
اپنی دنیا میں بھی توفیق نہ تھی
ان اندھیروں میں اجالے ہیں تیرے ہونے سے
اور اگر تو نہ رہے
تو یہ اک خواب ہے
ایک وہم ہے
کہ جس کا شعور
تیرے کھو جانے سے مٹ جائے گا

(1972)

تلاش

نور ہی نور تھا
اور وہ تھا
جیسے تھا بھی نہیں ہے بھی نہیں
اک سکوں ایک خوشی
ایسی خوشی
جیسے سوئے ہوئے معصوم سے ہونٹوں پہ تبسم کی کرن
زندگی موت
کوئی غم کوئی حسرت کوئی اُمید نہ تھی
صبح تھی جس کی کوئی شام نہیں

فکر آزاد نہ تھا
آنکھ گرفتار نہ تھی
بے نیازی تھی کہ جیسے ارمِ خواب وخیال
یک بیک
پہلی تخلیق ہوئی
شوق بیدار ہوا
جیسے ٹھہرے ہوئے پانی کو ہوا چھو جائے
خودنمائی نے
پرستاروں کو تخلیق کیا
جستجو تھی کہ کوئی
خود مجھے میرے مقابل کر دے
اور اب سوچ رہا ہو گا خدا
اُس نے کیا ڈھونڈ کے کیا پایا ہے
اِک سکوں
ایک خوشی
خودنمائی کے پرستار کو منظور نہ تھی
رینگتے
سلسلاتے ہوئے سانپ
ایک اک رگ میں اُتر آئے تھے

اور
کھینچے ہی لیے جاتے تھے
سیاہ اَن دیکھی ہوئی راہوں میں
بھید پانے کی تمنا نے
خود ایک بھید بنا ڈالا انھیں

اب
سکوں تھا نہ خوشی
وہ فرشتے نہ وہ حوریں نہ وہ جنت نہ وہ کیف
اک وجود ہے
کہ وہ ہے ننگ وجود
لیکن آدم کی یہ اولاد ابھی سوچ میں ہے
اس نے کیا کھویا ہے کیا پایا ہے

یہ
زمانوں کے
ستائے ہوئے انسان کی سوچ
اس سے اُلجھی
کبھی اس سے ٹکرائی
لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے
بہت دور نکل آئی ہے

پھر بھی
محسوس یہی ہوتا ہے
جیسے اک دائرے میں گھوم رہا ہے انسان
ڈھونڈنا اس کا مقدر ہے
مگر
ڈھونڈنے کو تو یہاں کچھ بھی نہیں
اک سفر ہے
مگر اس کی کوئی منزل ہی نہیں

جا رہے ہیں
مگر ہم کو کہیں جانا بھی نہیں

جانے کیا!
ڈھونڈ رہے ہیں لیکن
ٹینک توپیں یہ گرجتے ہوئے گرتے گولے
یہ بھی کچھ ڈھونڈ رہے ہیں شاید
اور اگر
ڈھونڈ بھی لیں گے
تو یہ کیا پائیں گے
کتنی بیکار تلاشوں کا لہو!

جوش ہے جذبہ ہے
اور شوق کے ہنگامے ہیں
گہری آنکھوں کی سیاہی میں کوئی ڈوب گیا
کوئی اُٹھتی ہوئی چمنی کے دھوئیں میں گم ہے
زندگی بھر کی تڑپ......
اس کے ماتھے سے ٹپکتی ہے پسینہ ہو کر
غیرتِ عزم ویقیں کے باعث
اس کا احساس لہو رنگ ہوا جاتا ہے
سہمی نظریں
یہ بلکتی جائیں
یہ سسکتی آہیں
یہ کسے ڈھونڈ رہی ہیں جانے!
کون آئے
جو انھیں آ کے تسلی دیدے
موت!
یوں تو ہر سمت نظر آتی ہے
ڈھونڈنے سے کہیں ملتی ہی نہیں
ڈھونڈنا کیا ہے
یہ پانا ہے کہ کھو دینا ہے

کتنے قیس آئے یہاں
محملوں کے لیے صحراؤں کو گلزار بناتے گزرے
کتنے فرہادوں کے
تیشوں سے چٹانوں کے جگر خون ہوئے
قرن ہا قرن سے
یہ ڈوبتا اُٹھتا سورج
فکر انسان کی مجبوری پر
خون کے اشک بہاتا ڈوبا
خون کے اشک بہاتا نکلا
یہ حماقت
یہ تلاش بے سود
ٹھیک ہے ٹھیک
مگر
اس طرف دیکھ ذرا
میں تجھے ڈھونڈ رہا ہوں اب تک

(1975)

کچھ بھی نہیں

چاندنی پچھلے پہر
گدگداتی رہی سناٹوں کو
بارہا ٹوٹ گیا رات کا تاریک جمود
جانے کب صبح ہوئی
کسمسائی ہوئی دھندلائی ہوئی
زندگی جاگ اُٹھی شوق نے انگڑائی لی
مست ہو ہو کے مچلنے لگی غنچوں میں ہوا
اور کلیوں سے بدن...... کھلتے رہے کھلتے رہے کھلتے رہے

مہکے جذبات کو
ہونے لگی منزل کی تلاش
آستاں مل گیا سجدوں کی فراوانی کو
پھر صنم آ گئے کعبہ میں صنم خانوں سے
شوق کو تاب نظر تک نہ رہی
ایک ہی آس ایک ہی احساس
آنکھ اُٹھتی نہیں لب ہلتے نہیں
دل یہ بیتاب......کوئی آئے کوئی آئے کوئی آئے

کھیلتے ہنستے ہوئے
روٹھتے منتے رہے
میں نے تم کو کبھی تم نے مجھے آنسو رلوائے
اور اک بار (کہ ہونا تھا یہی) روٹھ گئے چھوٹ گئے
چاندنی ایسی چھپی
سایہ تک پاس نہیں
کون ڈھونڈے کسے اب ۔کوئی نہیں کوئی نہیں کوئی نہیں

یاد کی بجلیاں
رہ رہ کے چمک اُٹھتی ہیں

زندگی کی یہ کشاکش یہ در و بام یہ لوگ
روشنی ہو تو نظر آتے ہیں
اور اندھیروں میں تو یادوں کے سوا کچھ بھی نہیں
جو ہے تو ہے جو نہیں ہے تو ہے
باقی سب وہم وجنوں وہم جنوں وہم وجنوں

پھر مجھے آئے ہیں
ہنستی ہوئی آنکھوں کے پیام
غنچۂ خود بن کے بہاروں کی نوید آتے ہیں
دعوتِ شوق پہ اُٹھے نہیں اب میرے قدم
اک خلا ہے میں جہاں سوچ میں ہوں
یہ دھڑکتے ہوئے دل
کپکپاتے ہوئے لب
اور پھر...... کچھ بھی نہیں کچھ بھی نہیں......
کچھ بھی نہیں

(1965)

نثری نظمیں

خالی

نیا سال 1987ء

سال گزر گیا
لیکن شاید نہیں گزرا
کہ ہم نے نوروز نہیں منایا
نہ گزرے برس کو پرانی شراب میں انڈیلا

سال کے گزرنے کی خبر تو آنے والا سال دیتا ہے
لیکن نیا سال کئی سال سے نہیں آیا

یوں لگتا ہے کہ وہی پرانا برس
ہر برس بھوت بن کر لوٹ آتا ہے
مردے کو اگر ٹھیک سے دفن نہ کیا جائے
تو اس کی روح بدروح بن جاتی ہے

جب تک پرانا سال دفن نہیں ہوگا
نیا سال نہیں آئے گا

چنگڑ مُردوں کو دفن نہیں کرتے
نہ قربان گاہیں بناتے ہیں

گزرے ہوئے سال کا پیغام یہ ہے
کہ اب ہمیں
بھوتوں اور چڑیلوں کے ساتھ جینے کا ڈھب سیکھنا ہوگا

خوف

خوف
چلچلاتی ہوئی سنسان دوپہر میں چیل کی آواز
نئے کٹھن امتحانوں سے گزرنے کا دھڑکا
محبت میں ٹھکرائے جانے کا خیال

خوف نے آدمی کو ہر طرف سے گھیرا ہوا ہے
لیکن
خوف

اگر بڑھتے ہوئے قدموں کو روکتا ہے
تو کچھ کر گزرنے کی دعوت بھی دیتا ہے
ہر خوف ایک جیسا نہیں ہوتا
خوف
قبرستان میں بھی ہوتا ہے
اور جنگ کے میدان میں بھی

(1983)

نظریہ

نہ میرا لباس اپنا ہے
نہ میرا گھر اپنا ہے
نہ میرا وطن اپنا ہے
میرے کپڑے لنڈے کے ہیں
میرا گھر متروکہ جائداد ہے
اور وطن کی بات میرے مذہب میں حرام ہے
کہ ہم بت پرست نہیں بت شکن ہیں

میرے آبا و اجداد بڑے جوشیلے تھے
وہ اپنا اور دوسروں کا خون بہانے سے کبھی نہیں گھبراتے تھے
اسی لیے وہ صاحبِ شرف و نسب کہلاتے تھے
لیکن میری رگوں میں ان کا خون نہیں
پیٹرول ہے پیٹروڈالر ہے
میری شریانوں میں
عربی عصبیت کے ساتھ ساتھ
صیہونی طمع گردش کرتی ہے
میں سود کھاتا ہوں
اور زکوٰۃ دیتا ہوں

(1988)

اپنا سایہ

روشنی کے کھمبے کے نیچے
میں نے اپنے سر کو اپنے قدموں میں اُلجھتے دیکھا
صرف اندھیرے ہی
آدمی کو پریشان نہیں کرتے
تیز روشنی کے نیچے بھی
اگر آدمی ساکت کھڑا رہے
تو اس کا سر
اس کی ٹانگوں کی سلاخوں سے آزاد نہیں ہو سکتا
میں نے ایک قدم بڑھایا
میرا سر پیروں کی قید سے چُھٹ گیا
میں قدم اُٹھاتا رہا
میرا قد بڑھتا رہا

(1991)

عزت

زندگی کے دو اصول ہیں
ایک پیار ایک طاقت
اور پیار بہت بڑی طاقت ہے

انسانوں نے مل کر کوشش کی
تو پہاڑوں سے نہریں نکالیں
صحراؤں کو گلزار بنایا
اور جب وہ ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہوئے
تو ہنستے بستے شہروں کو کھنڈروں میں تبدیل کر دیا
انسان کو انسان بنایا
محبت نے، ہمدردی نے

حیوان صرف طاقت کی زبان سمجھتا ہے
گدھوں پر صرف ڈنڈے پڑتے ہیں
یہی ان کے لیے عزت کا معیار ہے
جو پیار کی زبان سمجھتا ہے
کام وہ بھی کرتا ہے
لیکن پیار سے
عزت سے

(1991)

ٹوپی

آج ٹوپی کوئی نہیں پہنتا
مگر کبھی
ٹوپی عزت کا نشان تھی
فضیلت کی دستار تھی
تاج کجکلاہی تھی
لوگ سروں پر سجاتے تھے
عمامے، طرّے، ترکی ٹوپیاں
جناح کیپ، سولا ہیٹ، فلیٹ ہیٹ
ٹوپی اپنے وقار اور
دوسروں کے احترام کا نشان تھی
سپاہی کی پہچان تھی
عبادت کا لباس تھی

کہ خالی سر پر شیطان دھول مارتا تھا
ٹوپیاں، اب بھی پہنی جاتی ہیں
لیکن یہ جادو کی ٹوپیاں ہیں
اگلے زمانوں کی
کہ جنھیں اوڑھ کر آدمی غائب ہو جائے

آجکل کی ٹوپیاں
سروں پر نظر نہیں آتیں
آنکھوں میں جھلکتی ہیں
چتونوں میں ظاہر ہوتی ہیں
اب بھی ان میں بانکپن ہے
اب بھی اندازِ خسروی ہے
اب بھی شملے کی لمبائی فضیلت کا پیمانہ ہے

لوگ بڑی بڑی ٹوپیاں پہنے پھرتے ہیں
مگر بھول جاتے ہیں
کہ ٹوپی
اگر سر سے بڑی ہو
تو آدمی مسخرہ لگتا ہے
(1991)

تخلیق

آدم شجرِ ممنوعہ کے قریب گئے
تو یہ دنیا وجود میں آئی

پھر جب یورپ سے
ڈاکو، چور، لٹیرے
ملک بدر ہوئے
اور آسٹریلیا، امریکہ اور دوسری جگہوں میں پہنچے
تو نئی دنیا آباد ہوئی
اسی طرح شاید کل

کرۂ ارض سے کچھ بدکار نکالے جائیں گے
تو وہ ستاروں میں نئی دنیائیں بسائیں گے

اے اللہ
کیا دنیائیں اسی طرح وجود میں آتی ہیں؟
(1919)

مکتب

جب مکتبوں سے علم اُٹھ جائے
اور عالموں کی زبانیں گنگ ہو جائیں
تو بپھرتی ہوئی جوانیاں
طویل تجربوں کی بصیرتوں سے محروم ہو کر
بھٹکنے لگتی ہیں

ایسے میں جب کہیں سے کوئی سبق نہ ملے
تو زندگی خود درسگاہ بن جاتی ہے
مگر اُس درس گاہ سے جو سبق ملتے ہیں
ان سے علم کم
اور عبرت زیادہ حاصل ہوتی ہے

(1991)

اے اللہ

اے اللہ
تو رحیم ہے، تو کریم ہے
مگر تیرے بندے تیرے نام پر
ایک دوسرے کا خون بہاتے ہیں

تو ان سے یقیناً حساب لے گا
کہ تو عادل بھی ہے اور علیم بھی ہے
لیکن مجھے تیرا نام لینے والوں سے
ڈر لگنے لگا ہے
اس لیے کہ
تیرے نام پر نیکیاں بہت ہوئی ہیں
لیکن ظلم ان سے کہیں زیادہ ہوئے ہیں

(1991)

خلاء

زندگی میں کبھی کبھی
ایک خلاء سا محسوس ہوتا ہے
جیسے شاید کوئی کام ہونے سے رہ گیا
یا کوئی بات کہی نہیں جا سکی

ایک احساسِ زیاں ہوتا ہے
جو سمجھ میں نہیں آتا
کہیں دور
دل کی گہرائیوں سے
ایک آواز اُٹھتی ہوئی لگتی ہے

''جو ہونا چاہیے تھا نہیں ہوا
جو کرنا چاہیے تھا نہیں کیا''

(1991)

عصمت

جب اقدار بے معنی ہو جائیں
جب قانون کی تذلیل ہو
تو غیرت کا خاتمہ ہو جاتا ہے

جرمنی نے آسٹریا پر قبضہ کیا
مورخین نے اسے عصمت دری قرار دیا
اور اس کے نتیجہ میں عالمی جنگ
اور جنگ کے بعد جو کچھ ہوا

وہ بہت ہولناک تھا

جب طاقت ہی اصول بن جائے
تو عصمت کا تصور ہی ختم ہو جاتا ہے
اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا
کہ کس کی عصمت مجروح ہوئی

(1991)

نیا عالمی نظام

اُمیدیں ٹوٹ جاتی ہیں
لیکن جلد ہی پھر بندھ جاتی ہیں
مایوسیوں میں زندگی نہیں گزاری جاسکتی

جب تک سانس ہے
خواہشیں ہیں، ولولے ہیں

سکون، آرام اور خوشی......

جد و جہد بھی یہی ہے، منزل بھی یہی
فتح زندگی کی ہوتی ہے
ناکامیاں انفرادی ہیں
بے معنی ہیں

گُل مرجھاتے ہیں
گلزار کِھلے رہتے ہیں

(1991)

طنز و مزاح

خالی

بزم مشاعرہ

یوں تو ہر ایک بزم کی اپنی ہیں خوبیاں
پر جو مشاعرے میں ہے وہ بات ہے کہاں
کچھ فرق سامعین و مقرر نہیں یہاں
بزم سخن میں آ کے سب ہوتے ہیں گلفشاں
ان کے اگر ہیں شعر تو ان کی ہے واہ وا
اس سمت ہے مشاعرہ اس سمت داد را
پروازِ فکر ان کو دکھاتی ہے شاعری
اور ان کو نغمگی سے سلاتی ہے شاعری
دیوانہ اپنی دھن کا بناتی ہے شاعری
اس طرح اہل دل کو ستاتی ہے شاعری
کچھ لوگ جھومتے ہوئے کچھ اونگھتے ہوئے
کچھ یوں کہ جیسے حسنِ بیاں سونگھتے ہوئے

اس طرح محو بزم کمالاتِ فن میں ہے
روداد عشق سے اسے رعشہ بدن میں ہے
تعریف حسن سے وہ ادھر حسن ظن میں ہے
''یہ انجمن اک اور تیری انجمن میں ہے''

ایک ایک شعر ایک کہانی لیے ہوئے
اُن کا پیام ان کی زبانی لیے ہوئے

رنگِ مزاح سے یہ اگر کھلکھلا اُٹھے
گرمی سے شعر کی وہ ادھر بلبلا اُٹھے
کچھ شدتِ اثر سے اگر تلملا اُٹھے
ایسے بھی ہیں جنھیں نہیں بنتی بلا اُٹھے

فرما چکے جو شغلِ سخن آہ واہ ہے
آئے بھی اور اُٹھ بھی گئے جلسہ گاہ سے

اس سمت بھی حضور کوئی کم ستم نہیں
شاعر پہ کونسا ہے یہاں جو کرم نہیں
مانا کہ داد کا ہے انھیں اور غم نہیں
بیداد سے یہ داد پہ کچھ ایسی کم نہیں

''ان کا گلا خروشِ ترنم سے پھٹ گیا
تلوار سے بچا تو رگِ گل سے کٹ گیا''

آنکھوں کے سامنے ہیں پر یزاد گلبدن
شعروں کی تازگی سے وہ چہروں پہ بانکپن
عالم یہ ہے کہ دیکھ کے لعلیں رخ وژن
کچھ اپنا ہوش ہے نہ کچھ اندازہِ سخن

''اللہ، کیا ہمارے یہ سب شاہکار ہیں
ہم ہی جہانِ حسن کے پروردگار ہیں

اس سمت تو یہ جوش یہ جذبہ یہ اعتماد
اور پشت پر وہ داد بہ اندازِ انتقاد
چشمک بھی ہے انہی سے انہی سے طلب ہے داد
دلچسپ ہے یہ ان کے تکلف کا بھی تضاد

چپکے سے کہہ رہے ہیں یہ آپس میں ''کچھ نہیں''
چلّا رہے ہیں ساتھ ہی ''تحسین آفریں''

پر صرف ہاؤ ہو نہیں امرِ مشاعرہ
بزم مشاعرہ میں ہیں صدرِ مشاعرہ
تصویر اختیار بجبرِ مشاعرہ
لا کر بٹھا دئے گئے نذر مشاعرہ

خود تل رہنے یا گوہ سخن تولتے نہیں
سب بولتے ہیں آپ مگر بولتے ہیں

یہ داستاں تو خیر ہوئی میں کہاں گیا
اس انجمن میں ہے کہیں میرا بھی کچھ پتا
خونِ جگر سے نقش بنائے تو کیا ملا
یہ دوستوں کا شغل یہ تھوڑی سی واہ وا
شاعر کے حال پر یہ کرم بے پناہ ہے
''دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہے''
(1961)

''میں''

مجھ کو بے مہریٔ قسمت نے جو ناشاد کیا
پی سی ایس نے نہ سی ایس پی نے مجھے یاد کیا
یوں ہر اک خوابِ حسیں کو مرے برباد کیا
نونہالانِ وطن کا مجھے استاد کیا
جب کہیں بھی کسی مصرف کا نہ پایا مجھ کو
لا کے سقراط کی مسند پہ بٹھایا مجھ کو
یہ بھی اعزاز بہر حال مناسب ہی ملا
اپنی دانائی پہ کچھ شک مجھے پہلے بھی نہ تھا
علم سے جا کے جماعت کو جو مرعوب کیا
کیا بتاؤں کہ اثر ان پر کچھ اُلٹا ہی پڑا
بات بگڑی تو بہت تھی یہ بنائی میں نے
یعنی لیکچر کی جگہ چائے پلائی میں نے

پھر بھی کالج سے ہی وابسطہ ہو روزی تو حضور
نہ سہی علم مگر علم کا چرچا ہے ضرور
کوئی میڈ ایزی ہو میگزین ہو، ہو شمعِ کہ حور
اس اندھیرے میں تو ہے ایک کرن مطلع طور
ایک نکتہ جو کہیں کام کا پایا میں نے
جا کے ووگی[1] میں بہت شور مچایا میں نے
موپساں، گورکی، سقراط، غزالی، ایڈلر
گوئٹے، شیکسپیئر، میر، قآنی، ہومر
ہکسلے، مارکس، شوپنہار، میکالے، ایڈلر
ماوزے، ڈیم، خُرسچیف، کینیڈی، ہٹلر
لفظ اک ٹھوس حقیقت ہے خود اک ذات ہے نام
ورنہ معنی کی تو ہے وقت کے ہاتھوں میں لگام
یہ ڈیکیڈنٹ ہے اور اس کو فرسٹریشن ہے
مورہڈ ذہن یہاں اور وہاں اُلجھن ہے
یہ پروگریسو، وہ کلاسک ہے وہ ماڈرن ہے
الغرض حضرتِ نقاد کو ازبر فن ہے
اس قدر سہل یہ اعزاز جو پایا میں نے
ذوقِ تنقید کو سینہ سے لگایا میں نے

(ا۔ ووگی۔ راولپنڈی کا ایک چائے خانہ)

مجلسیں اب تو بپا ہونے لگیں شام ڈھلے
اہل فن اہل خرد حلقۂ یاراں میں جمے
کچھ کمی تھی ہی نہیں اہل عقیدت کی مجھے
گھیر لائے گئے شاگرد جہاں ہاتھ لگے

اک عجب رعب تھا ارباب سخن پر طاری
نطقِ عالی سے ہوئے فیض کے دریا جاری

جوش کو اور کبھی آزاد کو مطعون کیا
ٹی ایس ایلیٹ کو منافق کبھی مکّار کہا
قراۃ العین کے ناول کا ادھیڑا بخیا
وقت موقعہ کے مناسب میں ہر اک راہ چلا

اور جب اقبال کی عظمت کے ترانے گائے
ریڈیو سے بھی مجھے نشر کے پیغام آئے

خوب ہر سمت سے یوں میری پذیرائی ہوئی
حلقۂ اہل صحافت میں شناسائی ہوئی
پھر تو ہر بات سند تھی مری فرمائی ہوئی
اب نہ پوچھو کہ یہ کیوں حوصلہ افزائی ہوئی

ایسے اوصاف تولے جاتے ہیں درباروں میں
میں ایڈیٹر کے رہا حاشیہ برداروں میں

نشر گاہیں ہوں کہ مکتب ہو کر ہو نقد سخن
ان کا انداز نرالا ہے جدا ان کا ہے فن
محفلِ شعر و ادب ہو کہ صحافت کی لگن
ایک سے ایک کرشمون کا مُرقع ہے وطن

''پاؤں اُٹھتے ہی نہیں راہ میں بڑھنے کے لیے
کتنی قبریں ہیں یہاں فاتحہ پڑھنے کے لیے''

(1961)

مشقِ سحر (۱)

''اقبال اک برس جو مرا تاج سر ہوا''
مردہ رگوں میں خونِ جواں کارگر ہوا
درماندہ راہرو کو پیام سفر ہوا
حکمِ پریڈ یعنی بوقت سحر ہوا

صف بستہ ہر جوان ہوا آب وتاب سے
کیڑوں کی فوج گونج کے نکلی کتاب سے

چپ راست کا یہ ظلم یہ ڈھلتی جوانیاں
پھیلے ہوئے یہ زاویے سمٹے ہوئے جواں
بازو یہ کورے کورے یہ مستور پنڈلیاں......
پیر فلک کی ان پہ پڑی تھی نظر کہاں

مشقِ سحر کا حکم جو اک بار ہو گیا
''عالم تمام مطلع انوار ہو گیا''

۱۔ صدر ایوب نے پروفیسروں کے لیے صبح کی ورزش لازمی قرار دیدی تھی

جو مستعد تھے سارا جہاں ڈھونڈتے پھرے
یعنی کہ نیکروں کی دکاں ڈھونڈتے پھرے
کچھ نازنین طبع وہاں، ڈھونڈے پھرے
ایک ایک ڈاکٹر کا مکاں ڈھونڈتے پھرے
کچھ تو ہوئے علیل دوا نے بچا لیا
کچھ صالحین کو بھی خدا نے بچا لیا

قسمت سے ایک اور بھی نکلی رہِ فرار
یعنی وہ لوگ جن کا ضعیفوں میں ہے شمار
ان کو دیا گیا ہے نہ آنے کا اختیار
اب ہیں جوان اپنی جوانی پہ شرمسار
یہ جوش اک شباب کا آئنہ دار ہے
''پیری کے ولولے ہیں خزاں کی بہار ہے''

میداں میں آ گئے وہ مجاہد پۓ عمل
یہ بازوؤں کا لوچ کمر کا یہ کس یہ بل
اک اک قدم اُٹھا کے وہ رکھنا سنبھل سنبھل
مشکل میں ہے قبیلۂ سقراط آج کل
خود اپنے زور میں جو بڑھے لڑکھڑا گئے
گرنے پہ انکشاف ہوا گھاس کھا گئے

اس لا جواب مشق میں سنگت کا کیا سوال
ان کا ہے رُخ جنوب تو ان کا ہے رُخ شمال
یہ ہیں ہرن کی چال وہ ہیں فیل مست حال
ان کے خرامِ ناز میں ٹن ٹن کا ہے جمال
کس کس کی کیا ادا ہے بتاؤں کسے کسے
''آئنہ کیوں نہ دوں کہ تماشہ کہیں جسے''

میداں سے ایک ایک قدم ماپتے ہوئے
واپس ہوئے ہیں ضعف میں اب کانپتے ہوئے
عریانی بدن کو ذرا ڈھانپتے ہوئے
آ کر وہ کرسیوں پر گرے ہانپتے ہوئے
پھیلی ہیں عارضوں پہ شعائیں وہ نور کی
''پڑتی ہے آنکھ تیرے شہیدوں پہ حور کی''

ناخوشگواریوں تو ذرا ہے یہ روئیداد
بہتوں کو لیکن اس نے دکھائی رہ مراد
مایوس ہو چلے تھے بزرگانِ خوش نہاد
حاصل ہوا ہے پھر انھیں اگلا سا اعتماد
اے مشقِ صبح واہ تری کامیابیاں
یاروں نے کس مزے سے رچائی ہیں شادیاں
(1962)

گرلز کالج

یکایک جو کالج کی گھنٹی بجی ہے
تو رونق گراؤنڈ کی گھٹنے لگی ہے
کلاسوں کا احوال اب دیدنی ہے
کبھی شور و غل ہے کبھی خامشی ہے
''نہیں بولتی ہیں تو کب بولتی ہیں
''مگر بولتی ہیں تو سب بولتی ہیں''
ابھی مس جماعت میں آئی نہیں ہیں
تو حالات کس درجہ شور آفریں ہیں
شکیلہ کہیں ہیں جمیلہ کہیں ہیں
بچھڑ جو گئی ہیں تو چیں برجبیں ہیں
یہ اُن کے بلانے کو چلا رہی ہیں
وہ ان کو اشاروں میں سمجھا رہی ہیں

یہ آپس کی جھگڑے لڑائی کی باتیں
تو فوراً ہی صلح و صفائی کی باتیں
یہ اس کی بہن اس کے بھائی کی باتیں
غرض اک زباں اور خدائی کی باتیں
فقط اپنی دھن ہے پرائی نہیں ہے
یہاں پر کسی کی سنائی نہیں ہے
خدا جانے لیکن یہ کیا ماجرا ہے
کہ یوں دفعتاً شور و غل تھم گیا ہے
یہ احساس جا کر کہیں اب ہوا ہے
کہ ٹیچر تو کرسی پہ رونق فزا ہے
یہ ضبطِ مجسم یہ حسن مکمل
یہ ساری جماعت کا مقصود اوّل
یہ نوکِ مژہ کی اک ہلکی سی جنبش
یہ رفتار و گفتار میں حسن کاوش
یہ تمکین خاطر یہ اندازِ پوشش
غرض ہر ادا جان لینے کی خواہش
یہ پُرکاری و بے نیازی کا عالم
عنایت، نوازش زیادہ نہ کچھ کم

شروع اس طرف ہو گیا ان کا لیکچر
مگر اس طرف ان کو ہے شغل دیگر
لبوں کی ہو جنبش کہ دامن کی سرسر
نظر جائزہ لے رہی ہے برابر
پجارن کو دیوی کا ہر انگ بھائے
تبسم کوئی بے نظارہ نہ جائے
نگاہوں نے کچھ اس محبت سے دیکھا
کہ محسوس ہونے لگا اک نشہ سا
یہ خود اعتمادی یہ غمزہ بلا کا
نہیں کوئی دنیا میں اب اپنے جیسا
زمانے کے یوں بیش و کم دیکھتے ہیں
کہ اپنا ہی دم اور قدم دیکھتے ہیں
یہ ذہنوں پہ ہر لحظ چھانے کی کوشش
ہر اک دل پہ سکہ بٹھانے کی کوشش
جو سیکھا ہے سب کو سکھانے کی کوشش
بہر طور ان کو پڑھانے کی کوشش
جو مشکل ہے آسان اِن کے لیے ہے
دل ان کے لیے جان ان کے لیے ہے

کبھی قابلیت کا سکہ بٹھا کر
اسے ڈانٹ کر اُس طرف مسکرا کر
کبھی ایک رونی سی صورت بنا کر
وہی آزمودہ ادائیں دکھا کر
غرض حسب توفیق ہر کام کرنا
جماعت کو حیلوں سے یوں رام کرنا
یہ بازی گری ہو گئی ان کی قسمت
مگر اور بھی تلخ تر ہے حقیقت
نہ ہو گر جماعت کی نظرِ عنایت
نہ مکتب سے باہر نہ مکتب میں عزت
معلم کی ملّت کو پروا نہ ہو جب
مّربی ہیں پھر اس کے طفلانِ مکتب
(1962)

ناکردہ گناہ

پیہم اک درد ہے اک مفت کی رسوائی ہے
یعنی شاگرد ملے ہیں یہ سزا پائی ہے

نظریں ان کی بھی کلاسوں پہ لگی ہیں لیکن
دل نے آوارہ مزاجی کی قسم کھائی ہے

وہ جو کالج کے تھے مقتول بقولِ اکبر
ان کے ہاتھوں اب ہر اک جان پہ بن آئی ہے

شعر کے حسن کی ہے نوٹس کی سطروں میں تلاش
غالبؔ و میرؔ کو شامت یہ کہاں لائی ہے

نت نئے پیدا کیے جاتے ہیں تنقید میں رنگ
شیلے مجنوں ہے کہیں بائرن ہر جائی ہے

کوئی شاعر ہو مصنف ہو کہ افسانہ نگار
داخلی، خارجی صفراوی ہے سودائی ہے

شیکسپیئر سے ہو منسوب تو ہر لغو سی بات
مبلغ علم ہے عرفان ہے دانائی ہے

اور پھر اس پہ یہ دعوے کہ یہ ساری تحقیق
لیکچرر نے ہی بڑے شوق سے فرمائی ہے

یہ سب افکار کئے جاتے ہیں مجھ سے منسوب
میں نے ناکردہ نگاہوں کی سزا پائی ہے
(1962)

شکوہ طالبِ علم بحضور ممتحنِ محترم

میں نے سیکھا ہے کہ ہر ظلم پہ خاموش رہوں
آپ فرمایا کریں میں ہمہ تن گوش رہوں
بس سبق یاد رکھوں خود سے فراموش رہوں
آپ کے خمکدۂ علم کا مے نوش رہوں

یہ شکایت زرہِ مشق سخن ہے مجھ کو
ممتحن! آپ سے خاکم بدہن ہے مجھ کو

نشہء عشق کو چھوڑا غم ابجد میں پھنسے
گیس پیپرز کہیں لائے کہیں نوٹس لیے
کون سے غم تیری خوشنودی کی خاطر نہ سہے
ممتحن میرے مگر تجھ سے خدا ہی سمجھے

ایک نمبر نے لی جاں سوختہ سامانوں کی
حالتیں ہوگئیں پہلی سی مسلمانوں کی''

تو ہی کہہ دے کہ کبھی تیری گلی کو چھوڑا
تیرے احباب تیرے دوست کسی کو چھوڑا
واسطے دینے میں اللہ و نبی کو چھوڑا
''بت گری پیشہ کیا بت شکنی کو چھوڑا
پھر بھی ہم سے یہ گلہ ہے کہ وفادار نہیں
ہم وفادار نہیں تو بھی تو دل دار نہیں

سال بھر عیش سے آرام سے کالج میں کٹا
کچھ پڑھائی کی خبر تھی نہ لکھائی کا پتہ
نہ تو استادوں کا کہنا نہ بزرگوں کا سنا
جذبہ شوق نے لیکن یہ بڑا کام کیا
تھے سوالات تو مبہم پہ نہ چھوڑے ہم نے
بحرِ ظلمات میں دوڑا دئے گھوڑے ہم نے

مختصر ہم نے اگر لکھ دیا نمبر نہ ملے
اور زیادہ بھی جو لکھ آئے تو بہتر نہ ملے
یعنی دو چار چھ اس سے کبھی بڑھ کر نہ ملے
پاس ہونے کے یوں کہئے بر بر نہ ملے
ہم نے یہ بات کہی ہے تجھے وہ بھائی ہے
''بات کہنے کی نہیں تو بھی تو ہرجائی ہے''

اب ہے درکار سیاہی نہ قلم اور نہ نب
کہ جوانی خود ہی مطلوب ہے خود ہی طالب
دلِ آزاد بھلا کیوں ہو رہین کاتب
''عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالب''

ہم کو دینے تھے جوابات سوالوں سے غرض
کُھل کے دیتے ہیں سخی مانگنے والوں سے غرض

تجھ کو معلوم ہے ہم نے کبھی لکھا نہ پڑھا
ہم جماعت تھے ہمارے سو بڑے ہی علما
جس طرح اُن کو اس طرح ہمیں بھی پرکھا
تو نے شاہین کو مولے سے لڑایا اچھا

داد دے دل کی کہ کس غیظ سے پرچوں پہ پڑا
ورنہ اس طرح سے بے تیغ و تبر کون لڑا

ہم نے کہنا نہ سنا ٹھیک یہ الزام بجا
وقت کو ضائع کیا کچھ نہ کیا کام بجا
ذہن رکھتے ہیں بہت کند بہت خام بجا
کچھ ہمارے لیے ہونا تھا خوش انجام بجا

مشوروں سے بھی نصیحت سے بھی انکار نہیں
''ہم سخن فہم ہیں غالب کے طرفدار نہیں''

کہتے ہیں ہم میں سے کچھ پر ابھی کنڈیشن ہے
مستحق رحم کے ہیں آپ پہ بھی روشن ہے
حل جو پرچے کبھی ہو جائیں تو کیا اُلجھن ہے
کیا مگر کس کا گلہ ہو کہ فلک دشمن ہے
''نہ ہوئی گر مرے مرنے سے تسلی نہ سہی
امتحان اور جو باقی ہو تو یہ بھی نہ سہی''
(1961)

شکوۂ اقبال

کبھی میں حلقۂ اہلِ ورع میں تھا مردود
میرے خلاف تھے فتوے کبھی فقیہانہ

اور آج یوں ہے کہ مسجد میں برسرِ ممبر
مرے کلام کی دیتے ہیں داد مولانا

یہ انقلاب زمانے میں آ گیا کیسا
ہوا ہے ابلہہ مسجد ہی میرا دیوانہ

کبھی جنوں ہے کبھی کفر ہے مری ہر بات
کبھی مرے یہی اقوال ہیں حکیمانہ

نہ صرف شیخِ حرم ناقدانِ فن بھی یہ اب
عقیدتوں کا مجھے دے رہے ہیں نذرانہ

بتا رہے وہ ایگزیسٹنشلسٹ مجھے
یہ کیمیونزم کا کہتے ہیں مجھ کو دیوانہ

انھیں یقین کہ مرا فکر آمرانہ ہے
انھیں گماں کہ میں جمہور کا ہوں پروانہ

وصال و عشق کے مضمون یہ دل پسند ہوئے
مرے کلام کی قوالیاں ہیں روزانہ

خدا کرے کہ ہو ان کی عقیدتوں میں خلوص
خدا کرے کہ حقیقت نہ ہو یہ افسانہ

بنا رہے ہیں کچھ اس طرح وہ مجھے جیسے
''سب آشنا ہیں یہاں ایک میں ہوں بیگانہ''

میں جانتا ہوں یہ دنیا نہیں مقام مرا
گراں ہے اہل جہاں پر نوائے رندانہ

خلوصِ نیت ساقی پہ ہے شبہ مجھ کو
لرز رہا ہے مرا ہاتھ زیر پیمانہ

نہ ذکرِ رازی و رومی نہ یاد غالب و میر
منایا جاتا ہے پر عرس میرا سالانہ

مجھے تو ڈر ہے کہ اس ہنگامہ ستائش میں
دبا نہ دیں یہ کہیں میری آہ رندانہ

نہ میرے لفظ ہیں محفوظ اب نہ فکر مرا
''کہ میں ہوں محرم رازِ دروں میخانہ''
(1962)

واہ

یہ کس جگہ کا نام لیا تو نے دوست ''واہ''
یادش بخیر دل سے نکلتی ہے ایک آہ

پہلے بھی ایک واہ کی ہوتی تھی فیکٹری
تیار جس میں ہوتی تھیں اشیائے شاعری

تھا اس کی صنعتوں میں یہ افراط کا عمل
ایک ایک داد سے وہاں بنتی تھی اک غزل

وہ صنعتِ قدیم تو اب یادگار ہے
کہتے ہیں اسلحہ کا یہاں کاروبار ہے

ہے یوں تو شاعری میں بھی اک اسلحہ کا رنگ
ہوتی ہے بزم شعر میں ہر لحظ ایک جنگ

شاعر پہ جو گزرتی ہے وقت سخن نہ پوچھ
ہوتے ہیں وضع شعر میں کیسے محن نہ پوچھ

مضمون اور بحر میں ہے کشمکش اگر
ہیں قافیے ردیف سے جنگ آزما ادھر

محبوب ہے تو تیر و تبر سے سجا ہوا
میدانِ شعر جنگ کا نقشہ بنا ہوا

چرکے زباں کے تیز نگاہوں کے چلتے ہیں
شاعر کے ہونٹ شعلہ عارض سے جلتے ہیں

لیکن فقط یہی نہیں میدان کارزار
یہ ہے بڑا جہاد یہاں معرکے ہزار

محبوب سے تو حضرت شاعر نمٹ بھی لیں
پر غم یہ ہے کہ فکر کی میزان میں تلیں

یہ آرزو ہے سب پہ فضیلت نصیب ہو
نقاد دوستوں کو ہزیمت نصیب ہو

چھپ چھپ کے وار ہوتے ہیں ہنس ہنس کے لڑتے ہیں
تشبیہ سے کنائے سے یوں کام چلتے ہیں

بس مختصر یہ ہے کہ بزرگانِ محترم
اک دورِ سرد جنگ کے ہیں آفریدہ ہم

شاعر کا معرکہ کسی غازی سے کم نہیں
یہ فن بھی فنِ اسلحہ سازی سے کم نہیں
(1963)

ٹیڈی گرل

دنیا ہے اک فسانہ و تغیر و انقلاب
ہوتی ہے ایک ایک ورق بند یہ کتاب
کل تھیں حقیقتیں جو ہوئی ہیں خیال و خواب
ہر صبح چاک کرتی ہے اک رات کا نقاب
پیری مگر ہے اُٹھتی جوانی سے سرگراں
اب اعتدال ہے نہ یہاں اور نہ وہاں
وہ معترض ہیں جینز پہ یہ کونسی ہے شے
پاجامہ آدھا اس کی جگہ ہو تو ٹھیک ہے
حلیہ پہ شیخ جی کے انھیں آ رہی ہے قے
ان کی نوا الگ ہے تو ان کی جدا ہے لے
موضوع اس طرح کچھ اُلجھ کے سمٹ گیا
اس کشمکش میں جسم سے جامہ لپٹ گیا

ان سے ادب کے باب میں کیجیے اگر کلام
کہتے ہیں تیوریوں کو چڑھا کر خجستہ کام
حد ہے کہ ہو گئی ہے جوانی ہی اتہام
کچھ بات عقل کی ہو تو جائز ہے احترام
پہلے فقط لباس تھا اس طور دیکھیے
ضد نے چڑھا دیا ہے انھیں اور دیکھیے

یہ عمر کام کی یہ مشاغل نئے نئے
تکرار ان سے ہے کبھی ان سے مقابلے
کس طرح ہر قدم پہ دل و جان وارتے
پھر تے ہیں اک جہاں میں ہیرو نما بنے
نظم حیات جیسے ہو تضمین فلم کی
فٹ پاتھ ہو گئی انھیں سکرین فلم کی

آدم کے یہ سپوت تو اس رنگ سے ڈٹے
حوا کی بیٹیوں کا قدم اب کہاں ہٹے
داماں و جیب تنگ ہیں گیسو کٹے کٹے
کچھ خم ادھر بڑھے تو ادھر زاویے گھٹے
پیکر کو پیرہن میں پرونے کی کوششیں
کوزے میں بحر کو یہ سمونے کی کوششیں

سانچے میں ڈھالتی ہے جو نقش جمال کو
اس تنگ دامنی پہ ذرا غور تو کرو
پڑتا ہے اک قدم جو اُٹھاتے ہی پاؤں دو
جیسے پل صراط پہ چلنے کی مشق ہو

دو پیر چار سے ہوئے حسنِ بشر بڑھا
اب یہ کھلا کہ ایک ہی ہوتا تو خوب تھا

القصہ رنگ یہ سحر و شام دیکھیے
ان کی روش پہ ان کا ہر اقدام دیکھیے
وہ پختہ کار لوگ ہیں یہ خام دیکھیے
اہل نظر ہیں موردِ الزام دیکھیے

ان کی کہیں کہ ان کی کہیں کس طرح رہیں
دونوں کو ہیں شکایتیں اب کس سے کیا کہیں

محوِ تماشہ ہے یہ نگاہِ زمانہ ہیں
ان کو ہوا ہے عظمتِ ماضی پہ گر یقیں
ان کی نگاہیں مطلع فردا پہ جا لگیں
کیا ہو رہا ہے آج کوئی دیکھتا نہیں

''ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں
اب ٹھہرتی ہے دیکھیے جا کر نظر کہاں''

عبرت سرائے دہر میں گر آنکھ کھولیے
لازم ہے ایک حرف زباں سے نہ بولیے
پھرئے خراب و خوب کے معیار کو لیے
پر ناصحوں کی بات پرکھئے نہ تولیے

تشویش میرے حال پہ ان کو ہے اب ذرا
''میں ورنہ ہر لباس میں ننگِ وجود تھا''

(1962)

الوداع

میں نے زندگی میں کبھی پلٹ کر نہیں دیکھا
لیکن زندگی پلٹ پلٹ کر بار بار میرے سامنے آتی رہی
اور آج بھی جب ایک دور مکمل ہو رہا ہے
تو مجھے تیس برس کی طویل رفاقتیں نظر آ رہی ہیں
مسکراتے ہوئے چہرے جو شوق اور تجسس سے دمک رہے ہیں
گول گول آنکھوں میں شرارت بھری چمک
کچھ جاننے کی تڑپ
کچھ کھو دینے کی خواہش

چہروں سے چھلکتی ہوئی چاہت
جو دیکھنے والی آنکھوں میں چاہتوں کے طوفان کھڑے کر دے
میں نے ان سب کو دیکھا ہے
اور آج بھی سب کو دیکھ رہا ہوں
فاصلے جیسے درمیان سے اُٹھ گئے ہیں
کیلنڈر ہر سال بدلتا ہے
لیکن یہ صورتیں نہیں بدلیں
نہ میں بدلا
ہر برس ایک نیا جوش
ایک نیا ولولہ
لگتا ہے میں جہاں ہوں وہیں کھڑا ہوں
اور وقت کی گاڑی میرے سامنے سے گزرتی جا رہی ہے
لیکن اس میں بھی

۲

سب آنے والے چہرے وہی ہیں جو آگے جا چکے ہیں
میں نے سب دیکھا ہے
میں یہ سب دیکھ رہا ہوں
جیسے زماں و مکاں ایک دوسرے میں تحلیل ہو گئے ہیں
ہر چہرے میں ایک ہی چہرہ نظر آتا ہے

زمانے بدل جاتے ہیں پر نہیں بدلتے
نہ میں بدلا ہوں
ہر نیا سال
ایک نئی اُمنگ ایک نیا جوش
مجھے لگتا ہے کہ میں وہیں ہوں جہاں تھا
لیکن زندگی
تمام تر رنگینیوں کے ساتھ
رواں دواں ہے
مگر آج بھی یہ جدا ہوتے ہوئے چہرے
وہی ہیں جو پہلے بھی جدا ہو چکے ہیں

۳

میری دنیا میں آج اور کل نہیں
لیکن یہ نئے چہرے مجھے کچھ زیادہ بالغ نظر آتے ہیں
انھوں نے زمانے کے اُتار چڑھاؤ دیکھے ہیں
ان کے دل اُمیدوں کے ساتھ ساتھ
خطروں سے بھی بھرے ہوئے ہیں
یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے اپنے اردگرد
دنیا کو بنتے، بگڑتے، بکھرتے، سنورتے اور ٹوٹتے دیکھا ہے

لیکن انھوں نے یہ بھی دیکھا ہے کہ گروہی رقابتیں
ایک مقام پر پہنچ کی ذاتی شفقتوں میں ڈھل رہی ہیں

۴

یوں لگتا ہے کہ ظلم اپنی انتہا کو پہنچ رہا ہے
اور انسانی محبتیں بیدار ہونے لگی ہیں
اندھیرے چھٹ رہے ہیں، اُفق پر روشنی ہے
لیکن یہ روشنی میزائلوں اور ایٹم بموں کی نہیں
بلکہ انسان کے اس اعتماد کی روشنی ہے
جو بدترین حالات میں بھی ڈگمگایا نہیں

یہ چہرے دمکتے رہیں
یہ آنکھیں چھلکتی رہیں
میں بھی یہیں ہوں، آپ بھی یہیں ہیں
کوئی کہیں نہیں جائے گا

۵

صرف وقت گزرتا جائے گا
صرف وقت گزرتا جائے گا

(1993)